R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۵ - شمارہ ۲۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر جولائی ۱۹۶۶ء

آل احمد سرور

"کیا دِوانے نے موت پائی ہے"

ذوالنورین کی عین جوانی میں موت کا خیال آتا ہے تو مارلو معاصر شکسپیر کا یہ مصرع بے اختیار ذہن میں ہلچل مچانے لگتا ہے:۔

CUT IS APOLLO'S LAUREL BRANCH

ہمارے سماج کا یہ ایک المیہ ہے کہ بہت سے نوجوان جو اپنی ادبی صلاحیت کی وجہ سے ادب کے آفتاب و ماہتاب بن سکتے تھے یا جو ہماری دانش گاہوں میں علم کی روشنی پھیلا سکتے تھے، وہ سرکاری ملازمت کی کشش کی وجہ سے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھے۔ سرکار کو اچھے افسر مل گئے، مگر علم و ادب کا نقصان ہو گیا۔ ذوالنورین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

ذوالنورین سے میری ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ لکھنؤ اس زمانے میں علمی صحبتوں، ادبی مجلسوں، تہذیبی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھا۔ یونیورسٹی میں بلند پایہ لیکچر ہو رہے ہیں، انجمن ترقی پسند مصنفین میں کسی سماجی یا ادبی مسئلے پر بحث ہو رہی ہے، کافی ہاؤس میں ایک طرف ڈی۔ پی۔ مکرجی اور جیلانی راؤ بیٹھے ہیں۔ دوسری میز پر علیم صاحب، کالی پرشاد، پرکاش جوہری، شیام کرشن نراین ہیں۔ کسی اور میز پر مجاز کچھ شعرا کو لیے بیٹھے ہیں۔ کسی کونے میں ریڈیو کے کونسل، محکمۂ تعلیمات کے بھٹ، بی۔ بی۔ ساہی تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں۔ پیچھے آنند نراین ملا آئے اور کچھ لوگ ان کی میز کے "جمع ہو گئے۔ انھیں لوگوں میں ذوالنورین بھی ہوا کرتے تھے۔ ہنستے بولتے، اچھے شعر پر بے ساختہ اونچی آواز سے داد دینے والے۔ ادب کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھنے والے۔ دوستوں کے کام آنے والے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک قابل، ایماندار اور ذہین سرکاری افسر۔

ذوالنورین نے اعلیٰ تعلیم الٰہ آباد یونیورسٹی میں حاصل کی۔ رہنے والے بریلی کے تھے۔ ان کی دو بہنوں رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال کے ادبی کارناموں سے ارباب نظر واقف ہیں۔ ان کے بڑے بھائی نور العین اس زمانے میں جون پور میں سیشن جج تھے۔ ذوالنورین کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔ جلد ہی ہم لوگ ایک دوسرے کے خاصے قریب آ گئے۔ حضرت گنج کے قریب میں رہتے تھے اس لیے ان کے گھر پر بھی کبھی ادبی صحبتوں کے سلسلے میں۔ کبھی ویسے ہی جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر مرتبہ ان سے مل کر طبیعت اس طرح خوش ہوتی تھی جس طرح ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے یا کسی حسین منظر سے ہوتی ہے۔

ذوالنورین کی شادی میں میں شریک تھا۔ لکھنؤ میں ایک بزرگ خلیل احمد عمر زدہ تھے۔ ان کے نام سے لوگ زیادہ واقف نہ تھے۔ ہاں انھوں نے ایک ٹرسٹ جاری کیا تھا جو شکستہ مسجدوں کی تعمیر اور ایسے ہی کاموں کے لیے تھا۔ ان کی لڑکی سیلا آئی ٹی کالج میں کیمسٹری کی لیکچرر تھیں۔ ادب سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ ریڈیو پر اکثر فیچروں میں ان کا پارٹ ہوتا۔ ان سے ذوالنورین کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد آئی ٹی کالج کی ملازمت انھیں چھوڑنی پڑی۔

ذوالنورین بڑی اچھی غزل کہتے تھے مگر نہ سنانے کا شوق تھا نہ چھپانے کا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا شعری سرمایہ زیادہ نہیں ہے مگر جو کچھ ہے اس میں فکر کی تازگی اور اسلوب کی حسن کاری ملتی ہے۔ جدید شعور کلاسیکی ضبط و نظم میں ڈھلا ہوا۔ کاش ان کا مجموعہ کلام شائع ہو سکتا۔

جولائی ۵۵ء میں سری نگر میں ایک مشاعرہ تھا۔ لکھنؤ سے اس سلسلے میں میں، اندر لکھنوی، عمر انصاری، مجاز، جوش ملیح آبادی گئے ہوئے تھے۔ راستے میں مراد آباد سے روش کا ساتھ ہو گیا۔ میں، روش اور عمر انصاری حبیب احمد صدیقی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ مجاز کمال احمد صدیقی کے یہاں۔ ایک دن ہم لوگ حبیب احمد صدیقی کے یہاں بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ ذوالنورین نمودار ہوئے۔ معلوم ہوا کسی سرکاری کام سے کشمیر آئے تھے۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ کشمیر، وہاں کے مناظر، وہاں کے حسن، سب سے بیزار ہیں۔ حال پوچھا تو معلوم ہوا ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے کشمیر کی ہر چیز انھیں پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہے۔ چنانچہ ہم نے انھیں دعوت دی کہ سرکاری کام سے جو وقت بچے وہ ہمارے ساتھ گزاریں۔ دوسرے دن ہم سب گل مرگ گئے۔ اب ذوالنورین بالکل بدلے ہوئے تھے۔ نہ وہ افسردگی تھی نہ بیزاری۔ لطیفوں، قہقہوں، شعروں کا ایک آبشار رواں تھا۔ وہ سارا دن بڑے لطف سے گزرا۔ اب تک وہ لطف یاد ہے۔

فارسی کا ایک مشہور ہے ؎

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اپنے فرائض منصبی بڑی نمایاں کامیابی کے ساتھ ادبی ذوق کی چنگاری کو سنبھال سنبھال کر رکھنا، یا تو میں نے حبیب احمد صدیقی میں دیکھا یا صدیق حسن یا ذوالنورین میں۔ لکھنؤ سے ان کا تبادلہ دہلی کا ہو گیا تھا۔ ابھی دہلی کی زندگی کے مقامات سے گزر رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور ایک مختصر سی علالت کے بعد دوستوں، رفیقوں اور ساتھیوں کے ایک بڑے حلقے کو ماتم گسار چھوڑ گئے۔

ذوالنورین سے سماج، تہذیب، ادب کی کتنی توقعات تھیں، موت کے ظالم ہاتھوں نے سب کو ختم کر دیا۔ مگر موت بھی ان کی پاکیزہ شخصیت، ان کی محبت، ان کے خلوص، ان کے ذوق اور ان کی خدمت کے نقوش کو ان کے جاننے والوں کے دلوں سے محو نہیں کر سکتی۔

کابل میں ایک ہفتہ

پروفیسر آل احمد صاحب سرور کے سفرنامہ "کابل میں ایک ہفتہ" کی تیسری قسط آئندہ شمارے میں شائع ہوگی۔

ادارہ "ہماری زبان"

اردو میں ریسرچ فیلوشپ کے لیے تین اصحاب کا انتخاب

نئی دہلی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۳۰ امیدواروں کو سینئر ریسرچ فیلوشپ اور ۳۰ امیدواروں کو جونیئر فیلوشپ دینے کا اعلان کیا ہے سینئر فیلوشپ پانچ سو روپیہ ماہوار اور جونیئر فیلوشپ تین سو روپیہ ماہوار کا ہوگا اور امیدواروں کو دو سال تک ملے گا۔

اردو میں سینئر ریسرچ فیلوشپ کے لیے دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر اے۔ ایچ صدیقی اور جونیئر فیلوشپ کے لیے پٹنہ یونیورسٹی کے سید لے عالی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ایس ایس حسین کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(الجمعیۃ)

عظیم شاعر دانتے پر مقدمہ

جیوری نے اسے سات سو سال بعد بری کر دیا

ارتزو (اٹلی) دنیا کے عظیم شاعر دانتے کی سات سو سالہ تقریبات کے اختتام پر ارتزو میں سینٹ فرانسس چرچ میں دانتے کے مشہور مقدمے کی ازسرنو سماعت کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ دانتے سے متعلق تقریبات میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں۔ نیز اس پرانے مقدمے کو جس کے بارے میں قانونی ماہرین میں اب تک اختلافات چلے آ رہے ہیں ایک بار پھر ماہرین کے سامنے پیش کیا گیا۔ دانتے پر اصل مقدمے کے دوران جو شہادت قلمبند ہوئی تھی وہ کھو چکی ہے تاہم شاعر پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے اور اس کے لیے عدالت نے جو سزا تجویز کی تھی اس کی دستاویز فلورنس میں موجود تھی۔ یہ سزا دانتے کو ۱۳۰۲ء میں دی گئی تھی۔ اس پر پوپ اور چارلس دی والوئس کی مخالفت کرنے کا الزام تھا چنانچہ عدالت نے اسے پانچ ہزار فلورن جرمانہ کیا اور اسے مستقل طور پر سرکاری عہدے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔ دانتے نے اپنی صفائی پیش کرنے اور جرمانہ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ آخر ۱۰ مارچ کو اسے نئی سزا دی گئی جس کے تحت اسے ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اگر وہ کمیون کے علاقے میں پایا جائے تو اسے زندہ جلا دیا جائے لیکن جب اس نے یہ ذلت بھی برداشت کرنے سے انکار کر دیا تو اسے سزائے موت دی گئی اور اس کا تمام سامان تباہ و برباد کر دیا گیا۔ سزا ۶ اکتوبر ۱۳۱۵ء کو دی گئی تھی۔ ان سزاؤں اور عظیم شاعر کی زندگی کے مختلف واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے ارتزو میں مقدمے کی فرضی سماعت کے دوران الزامات اور ججوں کے فیصلے کی قانونی حیثیت پر غور کیا گیا۔ مقدمے کے لیے ارتزو کا مقام اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ دانتے نے سب سے پہلے یہیں پناہ لی تھی۔ جیوری میں اٹلی کے ممتاز ترین ادبا، محققین اور قانون داں شامل کیے گئے تھے۔ ججوں نے اپنے فیصلے میں دانتے کو بری کر دیا اور فریقین استغاثہ پر الزام لگایا کہ وہ دانتے کے خلاف نفرت سے اندھے ہو گئے تھے۔ (دعوت)

سوویت یونین کی زبانوں کے متعلق ۵ جلدوں کی نئی کتاب

ماسکو (تاس) سوویت عالموں نے ۵ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں پہلی مرتبہ سوویت یونین میں بسنے والے عوام کی پوری ۱۳۰ زبانوں کے متعلق مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

یہ کتاب نہ صرف قومی زبانوں کی موجودہ حالت اور ترقی کے متعلق معلومات فراہم کرے گی بلکہ سوویت حکومت کی قومی پالیسی پر بھی روشنی ڈالے گی۔

اس کتاب کی پہلی جلد جو سوویت یونین کی انڈو یورپی زبانوں سے متعلق ہے اسی سال شائع ہو جائے گی۔

"کوی" کو "شاعر" کی حیثیت سے امداد

کانپور۔ صوبائی حکومت کی طرف سے ہندی زبان کے ایک ممتاز کوی (شاعر) سری گیا پرشاد شکلا سنیہی کو ایک سو روپیہ ماہانہ کی امداد ملتی ہے۔ یہ معلوم کر کے انتہائی حیرت ہوئی کہ یہ امداد انھیں "اردو شاعر" کی حیثیت سے دی جا رہی ہے جب کہ کہا جاتا ہے کہ سنیہی جی اردو سے واقف تک نہیں ہیں۔ اس کو متعلقہ محکمہ کی بوالعجبی ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس غلط تقسیم سے کسی مستحق اردو شاعر کا حق بھی غصب ہو رہا ہو۔ (ریاست جدید)

شاذ تمکنت کا مجموعۂ کلام "تراشیدہ"

جولائی کے آخر میں منظر عام پر آ رہا ہے

حیدرآباد۔ ۸ جولائی۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ نئی نسل کے ممتاز شاعر جناب شاذ تمکنت کا پہلا مجموعہ کلام "تراشیدہ" جولائی کے آخر میں منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس مجموعہ کو نیشنل بک ڈپو حیدرآباد شائع کر رہا ہے۔ چہار رنگی سرورق، عمدہ گیٹ اپ، ضخامت ۲۰۹ صفحات۔

(ایک نامہ نگار)

رفیعہ سلطانہ

آگ کا دریا

(ایک جائزہ)

لکھنؤ کی سرزمین نے اردو ناول کو بہت سے رتن دیے۔ رجب علی بیگ سرور، سرشار، رسوا کے بعد قرۃ العین حیدر اسی لکھنؤ[1] کی سرزمین سے اٹھی ہیں جنھوں نے اردو ناول کو فکر و فن کی بلندیوں سے آشنا کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ "آگ کا دریا" بیسویں صدی کا عظیم ناول ہے لیکن تعجب کا مقام یہ ہے کہ ادبی حلقوں نے اس ناول کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں بڑی سہل انگاری اور بے توجہی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس عظیم فن پارہ کو ناول کی تنقید کے پرانے بندھے ٹکے معیاروں سے جانچنا چاہا مثلاً بعض کو اس میں دلچسپی کا فقدان محسوس ہوا۔ بعض نے اسے کردار نگاری کے اعتبار سے صفر پایا۔ بعض کو قرۃ العین کی "مخالف پاکستانی" ANTI-PAKISTANI ذہنیت کھلی۔ بعض نے اعتراف کیا کہ قرۃ العین بڑے بڑے مسائل کو چھیڑتی ہیں لیکن وہ ان سے پوری طور پر عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ایک مشہور نقاد نے اسے پڑھنے کے بعد رائے ظاہر فرمائی کہ "قرۃ العین کے اس ناول پر فیض کا یہ مصرع "جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے" چسپاں ہو سکتا ہے۔ نقاد موصوف کے خیال میں قرۃ العین حیدر نے بڑے بڑے مسائل کو چھیڑا ضرور ہے لیکن وہ ان مسائل کی پیش کشی میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

سچ تو یہ ہے کہ "آگ کا دریا" اردو ناول کی تکنیک میں بہت بڑا تجربہ ہے جس میں تاریخ، فلسفہ، ادب، جمالیات، عمرانیات کا بڑا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس کا شمار "شعور کی رو والے" STREAM OF CONC-IOUSNESS والے ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ "شعور کی رو والے" ناول جیسا کہ سب جانتے ہیں اردو میں دو تین ہی لکھے گئے۔ سجاد ظہیر کا "لندن کی ایک رات"، عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" اور قرۃ العین ہی کی "میرے بھی صنم خانے" شامل ہیں۔ یہ رجحان دراصل انگریزی کی وساطت سے اردو میں آیا۔ انگریزی ادب میں اس کے اچھے لکھنے والے جیمز جوائس، ورجینا وولف، پروسٹ اور ڈوروتھی رچرڈسن ہیں۔ ان لکھنے والوں نے "وقت" یا "زمان" کو ایک نئی جہت NEW DIMENSION کے ادب میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں وقت کا تصور انیسویں صدی کے روایتی ناول نگاروں سے ہٹا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا عنصر ہے جس میں کردار اور واقعات تنکوں کی طرح ڈول رہے ہیں۔ قرۃ العین نے بھی اس ناول میں "وقت" کا تصور خاص طرح سے پیش کیا ہے اور شعور کی رو یا لہر سے ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی تکنیک پر نظر ڈالی جائے یعنی یہ بتایا جائے کہ شعور کی رو یا لہر سے کیا مراد ہے اور قرۃ العین نے اسے کس طرح استعمال کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس ناول کا موضوع، پلاٹ اور اسلوب پر کچھ اختصار سے جائزہ لیا جائے۔ ناول کا موضوع بہت عظیم ہے یعنی "محبت" اور "انسان دوستی"۔

موضوع: سب سے پہلے ناول کے نام کی بلاغت پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ موضوع سمجھ میں آ سکے۔ میرے خیال میں قرۃ العین نے "آگ کے دریا"[2] کی اصطلاح اردو کے اس شاعر سے لی ہے جس نے "محبت" کے بارے میں لکھا تھا کہ "یہ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے"۔ اس ناول میں قرۃ العین نے محبت کا بڑا اعلیٰ تصور پیش کیا ہے جس کی مثال اردو ادب تو کیا عالمگیر ادب میں بھی ملنی مشکل ہے۔ یہ بڑا گمبھیر فلسفیانہ اور ساتھ ہی شاعرانہ تصور ہے۔ یعنی "دو روحوں کا اتصال"۔ دو روحوں میں ربط کیوں ہوتا ہے۔ بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ یونانی علم الاصنام میں ایک کہانی کے پیرایہ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونانیوں کے خیال کے مطابق انسان پہلے بیل (کرۃ ان) کی شکل میں تخلیق کیے گئے تھے۔ جب یونانیوں نے دیکھا کہ ان کی قوت بہت بڑھ گئی ہے تو انھوں نے انسانوں کو نصف نصف کرہ کی شکل میں منتشر کر دیا۔ یہ نصف کرہ جب اپنے اصلی نصف کرہ سے ملتا ہے تو تب زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ نصف کرہ اپنے اصلی نصف کرہ سے نہ ملنے پائے تو زندگی میں خلا رہ جاتا ہے۔ اس لیے ایک حصہ جب اپنے اصلی دوسرے حصے سے ملتا ہے تو خود بخود جسمانی، روحانی اور ذہنی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کرہ کا نصف حصہ دوسرے ملک اور دوسری قوم میں ملے یا اس وقت ملے جب دائرہ خلا کے ساتھ مکمل ہو جائے۔ چنانچہ LOVE AT FIRST SIGHT پہلی نظر کی محبت کی بھی تاویل اس کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ موجودہ جنسی علم نے دو مخصوص افراد میں کشش یا محبت کا باعث خون کے خلیوں کی جانچ پر کیا ہے۔ بسا اوقات ایک شخص کے خلیات دو اشخاص سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں LOVE TRIANGLE یا محبت کا "ابدی مثلث" بن جاتا ہے۔ قرۃ العین کے ناول میں گوتم کی ذات میں صرف چمپا ہی کو نہیں نرملا کو بھی دلکشی نظر آتی ہے۔ اسی طرح چمپک میں ہری شنکر بھی دلچسپی لیتا ہے۔ قرۃ العین نے گوتم اور چمپا کی باہمی کشش کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ یہ کشش اتنی عظیم ہے کہ زمانہ بھی اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ جس دور جس عہد میں بھی ملتے ہیں ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم اور چمپا جب ناول کے تیسرے حصے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں ایک دوسرے کو جانتے ہیں یعنی یگانگت اور اپنائیت کا احساس۔ یہ بات دوسری ہے کہ حادثات اور واقعات نے ان دو کو کبھی بھی ملنے نہ دیا۔ یہ محبت اتنی طاقتور ہے جس کے آگے زمانہ اور موت بھی جھک جاتے ہیں۔ اس کے ناول میں اقبال کے اس شعر کی تفسیر ملتی ہے کہ

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

محبت کے بعد انسان دوستی دوسری چیز ہے جس سے ناول کی فضا بھرپور نظر آتی ہے۔ قدیم و جدید کی کشمکش کو بھی جو ہر دور ہر عہد میں موجود ہے مصنفہ نے بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ قرۃ العین نے اس ناول

[1] ان کا وطن [illegible] ہے مگر لکھنؤ کا ان کے افکار و اقدار اور سیرت و کردار پر بہت گہرا اثر ہے۔ — ادارہ

[2] فرانسیسی ادب میں بھی "آگ کا دریا" نامی ایک ناول ملتا ہے۔

یہاں تین دور بنائے ہیں اور ہر دور کے ذہن پرست۔ جدیدیت کی دلدادہ نوجوان بھی ہیں، ہے ہیرو اور ہیروئن کو جنا ہے جنھیں ہر دور میں قدامت کی لہروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ساتھ ہی انھوں نے جنگوں سے نفرت دلائی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو اس ناول کو اعلیٰ مقام کرتا ہے۔ اور مصنفہ ایک بڑے فن کار کے روپ میں ابھرتی ہیں۔ جب وہ جنگ کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کا قلم نڈر، بے باک، بے رحم اور مصلحت سے بیگانہ بن جاتا ہے خصوصاً جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے موقع پر ان کا قلم بڑی جرأت فکر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انھوں نے جس بے جگری سے اس قومی المیہ کو بیان کیا اس پر اردو کے بہت کم ادیبوں نے توجہ دی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ناول ایک پرشکوہ انداز میں بلند ہوتا ہے اور بہت بڑے میدان میں پہنچ جاتا ہے گیتا کے اشلوک نے اس ناول کو بقول مجتبیٰ حسین ایک رزمیہ EPIC کی بلندی دے دی۔ گیتا کے اس اشلوک میں وسیع اور جاں گداز معنویت ہے۔

"اور جب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا:

"او جنار دھن! میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیان کھڑا کر دو تاکہ میں دیکھوں مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہیے" اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھے۔ باپ، دادا، چچا، بھائی، بھتیجے، دوست، استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔ تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا۔ او کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ او کیشو! میں میدان میں کھڑا نہیں ہو سکتا"

اس کے آگے ناول کی ساری خامیاں اور کوتاہیاں (اگر وہ ہیں) مٹ جاتی ہیں اور سامنے صرف ایک عظیم تہذیبی کشمکش رہ جاتی ہے۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں بڑے بڑے لکھنے والوں کے قدم ڈگمگا گئے مگر قرۃ العین نے جو استقامت اور پامردی یہاں دکھائی وہ اس دور ہی کے نہیں ہر دور کے ادب میں کم یاب ہے۔ اس موقع پر انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ بعض اہم سیاسی مسائل چھیڑے ہیں۔ ان کا ایک کردار پوچھتا ہے:۔

"پروفیسر بتاؤ میں کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے جنھوں نے میرے بے قصور بادشاہ کو معزول کر دیا، یا اس کٹر گو بادشاہ سے نفرت کروں جو ہندو دیوالی کا عاشق تھا اور کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کو قتل کرواتا تھا"

ان مقامات پر جہاں تاریخ خون کے آنسو بہا رہی ہے ان کا قلم حیران کن جرأت سے کام لے کر ان بلندیوں کو چھو لیتا ہے جہاں معمولی لکھنے والوں کا تو ذکر کیا بڑے بڑے پختہ کاروں کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔

پلاٹ موضوع کے بعد دوسری چیز ہے اس کا پلاٹ۔ جو چار علیحدہ علیحدہ ادوار میں منقسم ہے۔ بظاہر ان میں کوئی ربط نہیں، سوائے اس کے کہ یہ لکھنؤ اور اس کے اطراف و اکناف (فیض آباد) کی داستان ہے جب لکھنؤ لکھنؤ نہیں شراوستی اور فیض آباد، ایودھیا نہیں، فیض آباد تھا۔ یہی کے کردار گوتم اور چمپک ہیں جو صدیوں کے بعد بھی ایک دوسرے کو ڈھونڈنے کی سعی میں منہمک نظر آتے ہیں۔ ہکسلے کے ناول BRAVE NEW WORLD کی طرح چار الگ الگ ٹکڑے ایک ساتھ جڑے ہیں، ان میں ایک تسلسل ہے، وہ تسلسل وقت یا زمان ہے جو ان چاروں حصوں کو ایک لڑی میں گوندھتا ہے۔

پہلا دور۔ حضرت عیسیٰ سے تین سو سال قبل شروع ہوتا ہے اور مسلمانوں کی آمد تک یعنی تاریخ کی رفتار ایک رہتا ہے یعنی چندر گپت موریا سے پہلے نند خاندان کے عہد میں شروع ہوتا ہے جب برہمن ازم کا بدھ مت اور جین مت کے اصولوں سے تصادم ہو رہا ہے۔ جب ٹیکسلا، نالندہ، گندھارا، شراوستی کی یونیورسٹیاں آباد ہیں جہاں رات دن مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ اس میں وید اور گیتا کے حکیمانہ اقوال اور منتر ہی نہیں، مہاویر اور گوتم سدھارتھ کی عظیم شخصیتیں ملتی ہیں۔ مہاپدم نند چانکیہ، چندر گپت موریا کے زمانے کا نظام سلطنت ملتا ہے۔ ویشالی، گیا، کاشی، اجین شہر ملتے ہیں سلطنت مگدھ کے داغ بیل ڈالے جانے کی تفصیل ملتی ہے، اور موریا حکومت کی شان و شوکت، پاٹلی پتر کی رونق و دلچسپی کی صورت میں سامنے آ جاتی ہے۔ ان واقعات کو بیان کرنے میں قرۃ العین نے کافی محنت کی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک صفحے اور ایک ایک سطر کے لیے انھوں نے نہ صرف ہندوستان قدیم کی تاریخ پڑھی بلکہ پلوٹارک[1] اور میگاس تھینز کے سفرناموں سے بھی استفادہ کیا۔ اور بدھ مت اور جین مت کی مقدس کتابیں دیکھیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ۴ بڑی ریاستیں تھیں:۔

(۱) مگدھ (۲) کوشل (۳) وتسا (۴) اونتی۔

مگدھ کا صدر مقام پہلے راج گرہ تھا جو موریا حکومت میں پاٹلی پتر بنا۔ "کوشل" کو شراوستی، ایودھیا اور وتسا کو کوسمبی، اونتی کو اجین۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی ریاستیں تھیں جیسے انگا (بنگال) پنچال (پنجاب)، گندھارا (شمال جنوبی سرحد)۔ گوتم کو مہاپدم نند کے آخری زمانے میں دکھایا گیا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے۔ اس کے بعد چندر گپت موریا کا دور شروع ہو جاتا ہے اور پاٹلی پتر کو شہر اہمیت اختیار کر لیتا ہے لیکن گوتم کے شعور کی لہر کے ذریعے قرۃ العین نے چندر گپت موریا سے پہلے کے بادشاہوں بم بسار اور اجات شترو کے اہم واقعات کو بھی پیش کر دیا ہے کیونکہ قرۃ العین کے نزدیک شعور کی رو کے دوسرے لکھنے والوں کی طرح، یعنی ایک دریا بغیر منبع کا آدمی ہے جو تجربوں کو جمع کرتا جاتا ہے اور پھر ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ انھیں حافظہ کی مدد سے دہرا دیتا ہے اس طرح "وقت" یا "زمان" ان ناولوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ ناول کا ہیرو گوتم حضرت عیسیٰ کے چھ سو سال قبل کی معاشرت کے ساتھ ساتھ مہابھارت کے زمانے کو بھی اپنے "شعور" میں محفوظ رکھتا ہے اور قاری

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

[1] پاٹلی پتر کی تفصیل انھوں نے میگاس تھینز کے سفرنامے INDICA سے لی ہے۔

عبدالمجید ھانگل

کرناٹک کا ایک مشہور لوک گیت

آنگن میں کنواں کھدا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا
کاتے کی رسّی جو ہاتھوں کو چبھنے
ریشم کی ڈوری منگا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا
کپڑے کی چپل جو پاؤں کو چبھنے
مخمل کی چپل منگا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا
دھنواڑی ساڑی جو آنگ کو چبھنے
بمبئی کا وائل منگا دے مورے راجا
نیم کی کاڑیاں جو کانوں کو چبھنے
سونے کی بالیاں منگا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا
کانچ کی چوڑیاں جو ہاتھوں کو چبھنے
سونے کی چوڑیاں منگا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا
سڑکوں کے کنکر جو پاؤں کو چبھنے
مدراسی چپل منگا دے مورے راجا
میں بھرتی ہوں پانی دیکھے نہ جانا

شاہد عزیز

تنہائی

جھیل کے کناروں پر
چاندنی دمکتی ہے
اور یہ حسیں لمحے
جانے کیوں سلگتے ہیں
جس طرف نظر ڈالو
خامشی کے سائے ہیں
ذہن کے دریچوں میں
زخم مسکرائے ہیں
زندگی کے ویرانے
اب کبھی نہ مہکیں گے
سوچتی ہے تنہائی
کون آنے والا ہے!

غزلیں

زیبا ردولوی

تڑپتے تڑپتے سکوں پا گئے ہیں! جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے ہیں!!
بہار آئی شاید کہ پھر کچھ پرندے چہکتے ہوئے ہم نے دیکھا! آ گئے ہیں!!
یہاں چھاؤنی چھائے گا کون ہم تو! ذرا سے ذرا باغ میں آ گئے ہیں!!
چلو! فرق کر لیں خدا، ناخدا میں نہ طوفاں گئے ہیں نہ دریا گئے ہیں!!
تمنائے گلچیں ہے اپنے دل میں بہت پھول کھل کھل کے مرجھا گئے ہیں!
بہت دعویٰ رہبری کرنے والے! تری راہ میں ٹھوکریں کھا گئے ہیں
محبت کی مجبوریاں کون جانے! مجھے ضبط کرنے کو فرما گئے ہیں

نظر سے نظر کا تصادم تھا زیبا
زمیں آسماں آج ٹکرا گئے ہیں

عظیم حیدرآبادی

رُخِ شباب کی سی کیفیت ہے تب و تاب کی سی کیفیت
دل میں ہیجان سا مچاتی ہے چشمِ پُر آب کی سی کیفیت
رقص فرما ہے چشمِ ساقی میں بادۂ ناب کی سی کیفیت
دل کی دھڑکن میں پائی جاتی ہے دردِ بے تاب کی سی کیفیت
ان کے اندازِ گفتگو سے عیاں تارِ مضراب کی سی کیفیت
اشک لغزش میں کچھ لگی بھی کبھی دُرِ نایاب کی سی کیفیت
میری تقدیر ہی میں لکھی ہے گردشِ آب کی سی کیفیت
خندۂ دوست میں ہے پوشیدہ تیغ زہر آب کی سی کیفیت
اُن کے لطف و کرم کا کیا کہنا! نقش بر آب کی سی کیفیت

مرتسم ہو رہی ہے دل پہ عظیم
چشمِ خوں ناب کی سی کیفیت

صلاح الدین نیر

جہانِ شوق کا شیرازہ جب بکھرتا ہے وفا شناس بھی ہواؤں سے ڈرتا ہے
بقدرِ ظرف ابھی سے کششوں کو پینے دو رُخِ حیات سے خود ہی نقاب اُترتا ہے
جمالِ دوست کبھی آنسوؤں میں چھن چھن کر ادھوری زیست کے خاکوں میں رنگ بھرتا ہے
نگاہ ملتے ہی ہاتھوں سے جام چھوٹ گئے تری نگاہ میں اک دور رقص کرتا ہے
مرے بہکنے کو تمہید بے خودی نہ کہو خودی کا نشہ بہت دیر سے اترتا ہے
یہی ہے جبرِ محبت کہ کوئی دیوانہ نہ بھول سکتا ہے جس کو نہ یاد کرتا ہے
بہار ہنستی ہے جب بھی خس نصیبوں پر شگفتہ پھول کی آنکھوں میں خوں اترتا ہے
بفیضِ حوصلہ کچھ اور چوٹ کھانے سے نئی حیات کا حسن اور بھی نکھرتا ہے
بہار جب درِ گلشن پہ دیتی ہے دستک خزاں کا قافلہ گھبرا کے خود ٹھہرتا ہے

خود اپنی دھڑکنیں ہوتی ہیں اجنبی نیر
دلِ غریب پہ وہ وقت بھی گزرتا ہے

صفحہ ۴ سے آگے

گوتم ماہر اس دور کی جھلکیاں بھی دکھا دیتا ہے کیونکہ کبھی تو وہ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ کے وعظ یاد کرتا ہے۔ کبھی رام چندر جی کی مہارانی سیتا کے متعلق سوچتا ہے۔ کبھی اسے کورو پانڈو کے ارجن کا خیال آتا ہے۔ اس طرح شعور کی لہر کی تکنیک اس ناول کے لیے اور بھی کارآمد نظر آتی ہے۔ ویسے ہیرو گوتم مہاراجہ بمبسار[1] کے متعلق ایک ڈراما بھی لکھتا ہے۔ چندرگپت موریا جس کا اس ناول میں ذکر ملتا ہے۔ ایک شودر تھا جس نے نند خاندان کے آخری سمراٹ کو اپنے برہمن وزیر وشنو گپتا (جس کا نام چانکیہ بھی ہے اور کوٹلیہ[2] بھی) کی مدد سے ختم کیا اور موریا سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور شمال کی تمام ریاستوں کوشل، اونتی پر قبضہ کر لیا۔ اسی کے زمانے میں پاٹلی پتر کا شہر بسا۔ اسی زمانے میں میگاس تھینیز بھی یونان سے ہندوستان آیا تھا۔ نیز ایک ڈراما مدرا راکشس اس عہد کی یادگار ہے۔ قرۃ العین نے اپنے ناول کا مسالہ میگاس تھینیز کے سفرنامے کے علاوہ مدرا راکشس سے بھی لیا ہے۔

اس زمانے میں شراوستی کی درسگاہ برہمن مذہب کی تعلیم کا اہم مرکز تھی۔ نالندہ اور ٹیکسلا میں برہمن مت کے علاوہ بدھ اور جین مذہب کے علما بھی درس دیتے تھے اور ان مذاہب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ معاشرہ چار بڑے طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ برہمن جن کا کام تحصیل علم تھا۔ کشتری لڑائی کے فن کے ماہر تھے اور ویش تجارت کرتے تھے۔ شودر سماج کا وہ نچلا طبقہ تھا جو ان کی خدمت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ آشرم سماج کے بڑے مرکز تھے جن میں ہر شہری کو زندگی گزارنا ضروری ہوتا۔ ہر شہری کی زندگی کے چار مرحلے ہوتے تھے۔

(۱) برہم چاریہ۔ یہ دور ریاضت اور نفس کشی یعنی حصول علم کا دور ہوتا تھا جس میں دنیوی عیش و عشرت سے احتراز لازمی تھا۔

(۲) گرہست۔ شادی کے بعد کا دنیوی کاروبار کا دور۔

(۳) بن پرستھ۔ ادھیڑ عمر کا زمانہ جس میں انسان عملی زندگی کے بکھیڑوں سے کچھ کچھ کنارہ کش ہوتا تھا۔

(۴) سنیاس یا یوگ۔ جب لوگ گھربار دنیوی عیش و عشرت کو تج کر مذہب کی طرف رجوع ہو جاتے۔

شروع میں گوتم کا برہم چاریہ دور دکھایا گیا ہے۔ اس کے گرہست اور بن پرستھ کے زمانے جنگ کی خونناکیوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور وہ سنیاس لینے سے پیشتر تیرتے تیرتے ڈوب کر مر جاتا ہے۔

کہانی میں گوتم کوشل دیس کے مہامہوپت کا بیٹا یعنی برہمن دکھلایا گیا ہے جو شراوستی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ جدید مکتب خیال یعنی بدھ مت سے متاثر ہے۔ ایودھیا سے شراوستی جاتے ہوئے اُسے گنگا گھاٹ پر دو لڑکیاں چمپک اور نرملا بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جن میں سے چمپک راج گرو کی لڑکی ہے اور نرملا کوشل کی راجکماری۔ گوتم پہلی نظر میں چمپک سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اُسے چمپک کے روپ میں ایک جانی پہچانی روح نظر آتی ہے اور اچانک عجیب سی یگانگت اور ذہنی رفاقت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے آشرم واپس آ جاتا ہے اور تحصیل علم میں لگ جاتا ہے یہ اس کا برہم چاریہ کا دور ہے جس میں کسی عورت کی طرف دیکھنا بھی پاپ سمجھا جاتا تھا لیکن وہ ذہنی باغی ہے۔ اس کے دماغ پر چمپک چھائی رہتی ہے۔ وہ تصویریں بناتا ہے۔ نظمیں لکھتا ہے۔ درسگاہ کے تعلیمی مناظروں میں شریک ہوتا ہے۔ اس زمانے کی تعلیم جیسا کہ نالندہ کے متعلق پروفیسر مکرجی لکھتے ہیں: "مناظروں اور مباحثوں پر مبنی ہوتی تھی۔ جو رات رات بھر جاری رہتی۔ ناول میں گوتم کو بھی ان مناظروں میں حصہ لیتے دکھایا گیا ہے۔ گوتم کے طالب علمی کے دور کو مصنفہ نے خوب خوب طرح سے ابھارا ہے جس سے اس کی ذہنیت اور شخصیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

جب گوتم ایودھیا سے شراوستی لوٹتا ہے تو اس کی ملاقات ایک دوسرے برہم چاری ہری شنکر سے ہوتی ہے جو بدھ مت کے زیر اثر بھکشو بن گیا ہے۔ وہ ایودھیا کا راجکمار ہے جو بدھ مت کے اصولوں سے متاثر ہو کر راج پاٹ تج چکا ہے۔ چنانچہ اس دور کی تواریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف عام آدمی بلکہ راجہ، مہاراجہ، راجکمار، راجکماریاں بھی بدھ مت کی تعلیمات کی وجہ سے بھکشو اور بھکشنیں بن رہی ہیں۔ قرۃ العین کے الفاظ میں: "سارا ملک تاریخی رنگ میں رنگا گیا ہے۔" گویا بدھ مت اس عہد کا جدید ذہنی فیشن اور نئی نسل کا محبوب عقیدہ بن گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بدھ مت اور جین مت کے ساتھ برہمن مذہب کا تصادم ہوا۔ درسگاہوں میں بدھ مت، جین مت کی کتابوں کے ساتھ ویدوں اور پرانوں یعنی برہمن ازم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ گوتم اور ہری شنکر میں عقائد کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ گوتم کٹر برہمن کی طرح ویدوں کے اصولوں سے ہٹنا نہیں چاہتا۔ ہری شنکر بدھسٹ ہے۔ گوتم ہری شنکر سے پوچھتا ہے۔

"تمہیں ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے۔"

ہری شنکر گوتم کو اپنے حالات سناتا ہے کہ اس نے کس طرح راجگدی ٹھکرا کر پنجاب، بنگال کی یاترائیں کیں۔ اسے بھی چمپک سے محبت ہے چونکہ بدھ مت میں خواہشات پر قابو پانا سکھایا جاتا ہے اور اس کا اصول نفس کشی ہے۔ اس لیے وہ دنیاداری کے بکھیڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہری شنکر کے ذہن میں کسی قسم کی الجھن نہیں۔ اس نے ایک نصب العین "مذہبی خدمت" کو اپنا لیا ہے اور وہ اسی کے پیچھے سرگرداں ہے۔

اب دونوں برہم چاری نوجوان ہری شنکر اور گوتم گھومنے نکلتے ہیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق تمام شہری ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ہری شنکر واپس لوٹ جاتا ہے۔ گوتم شراوستی میں واپس آتا ہے۔

(باقی آیندہ)

[1] مہاراجہ بمبسار شیشوناگ خاندان کا راجہ تھا۔ اسی کے زمانے میں مہاویر وردھمان اور گوتم سدھارتھ پیدا ہوئے تھے جنھوں نے بدھ مت اور جین مت مذہبوں کی بنیاد ڈالی۔

[2] کوٹلیہ کی کتاب "ارتھ شاستر" [illegible] کے متعلق ہے۔

مراسلات

حسنِ مطلع یا زیبِ مطلع

(۱)

جناب سید مجاہد حسین صاحب رضوی ۲۲ر جون کے ہماری زبان میں حسن مطلع کی صراحت کے متعلق صلائے عام دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ گوشہ گیر فقیر بھی عرض نیاز پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔

حسن مطلع کے متعلق محترمی ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب کا خیال درست ہے کیونکہ فن کی مستند کتاب "بحر الفصاحت" میں صاف صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ مطلع کے بعد بیت ثانی کو حسن مطلع یا زیب مطلع کہا جاتا ہے ہاں اگر دوسرا شعر مطلع ہو تو اسے مطلع ثانی کہیں گے۔ اسی طرح مطلع ثالث یا مطلع رابع یا چہارم وغیرہ (بحر الفصاحت صفحہ ۷۹) بعض اوقات ایک غزل میں کئی مطلعے آجاتے ہیں۔ جیساکہ لطف نے ایک غزل چودہ شعر کی لکھی ہے اور وہ سب شعر مطلعے ہیں۔ اسی طرح ذوق کی اس غزل میں دس مطلعے ہیں ؎

ترے کوچے کو وہ بیمار غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

امانت کی اس غزل میں ۱۱ مطلعے ہیں ؎

نظر میں تولتا ہے شعر اب ہر [illegible]
امانت گرم ہے بازار اپنی طبع موزوں کا

اسی طرح امانت کی اس غزل میں ۹ مطلعے ہیں ؎

معراج میں ہوا شرف گردوں جناب کا
ذرّے کو حق نے رتبہ دیا آفتاب کا

غیاث اللغات میں صفحہ ۱۹۳ پر بھی حسن مطلع کی یہی تعریف کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو "حسن مطلع"۔ بیت دوم از غزل و قصیدہ کہ بعد مطلع باشد

(رتن چند وردی، سری ہرگوبند پور)

(۲)

"ہماری زبان" بابت ۲۲ر جون ۱۹۶۶ء کے شمارے میں سید مجاہد حسین رضوی نے حسن مطلع یا زیب مطلع سے متعلق چند ادیبوں کے متضاد خیالات پیش کرتے ہوئے "اہل نظر" سے رہنمائی طلب کی ہے۔ میری ناقص رائے میں ڈاکٹر سید رفیق حسین صاحب اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ اکثر کتب قدیم اور لغات قدیم سے اس کی سند ملتی ہے مثلاً سید احمد دہلوی "فرہنگ آصفیہ" کے صفحہ ۱۹۱ پر حسن مطلع کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں: "اسم مذکر (عروض) غزل یا قصیدے کے مطلع کے بعد "شعر" یا "بیت"۔" اور "غیاث" میں مذکور ہے: "بیت دوم" از غزل و قصیدہ کہ بعد مطلع باشد" [illegible]

"احسن القواعد" کے مصنف محمد عبد الاحد صاحب نے تو کتاب مذکورہ کے صفحہ ۱۰۳ پر واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "قصیدہ اور غزل کے شعر اول کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اس کو مطلع کہتے ہیں اور جو "شعر" مطلع کے بعد کا ہوتا ہے اس کو حسن مطلع کہتے ہیں۔ اور جس شعر میں شاعر اپنا تخلص درج کرتا ہے یعنی شعر آخر کو "مقطع" بولتے ہیں اور سب سے عمدہ شعر کو "شاہ بیت" کہتے ہیں۔"

ان مستند حوالوں سے یہ بات کلیتاً تسلیم کی جا سکتی ہے کہ "حسن مطلع" وہی کہلائے گا جو مطلع کے بعد کا "شعر" ہوگا۔ ایک مطلع کے بعد اگر دوسرا مطلع کہا گیا تو وہ مطلع ثانی ہی ہوگا نہ کہ حسن مطلع!

بیشتر کتب جدیدہ میں بھی حسن مطلع کی یہی تعریف ملتی ہے کیونکہ "پرانے چراغوں" سے ہی "نئی شمعیں" روشن ہوتی آئی ہیں۔ علامہ اخلاق دہلوی نے "فن شاعری" اور مرزا محمد عسکری نے "آئینہ بلاغت" میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ غالباً روا روی کا نتیجہ ہے ورنہ ان کا مقصد اس سلسلے میں اختلاف پیدا کرنا ہرگز نہ ہوگا۔ ایسی جزئیات میں تسامح ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ مطلع کے بعد کا شعر حسن مطلع ہوتا ہے۔ ویسے مطلع ثانی بھی ایک شعر ہی کہلاتا ہے اس لیے لوگ اسے بھی حسن مطلع کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ مطلع ثانی کو حسن مطلع کہہ دینا قاعدے کے خلاف ہے۔ رضوی صاحب کا یہ کہنا کہ مطلع ثانی کو حسن مطلع کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟ تو کیا میں ان سے دریافت کر سکتا ہوں کہ مقطع کو مطلع اور مطلع کو مقطع کہہ دینے میں کیا قباحت ہے؟

(نذیر محمد خاں صبا ٹونکی۔ گورنمنٹ مڈل اسکول باسنی ناگور)

(۳)

ہفت روزہ رسالہ "ہماری زبان" مطبوعہ ۲۲ر جون ۶۶ء کے صفحہ ۷ کالم ۱ کے آخر میں (حسن مطلع یا زیب مطلع) کے عنوان سے چند ادبی حضرات کے متضاد خیالات نظر سے گذرے۔

مطلع کے لغوی معنی ہیں "جائے طلوع" جس شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ معہ ردیف ہو اس کو اہل عروض مطلع کہتے ہیں۔ قصائد میں کئی مطلعے ہوتے ہیں ان کو مطلع اول مطلع ثانی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ مطلعے غزل کی طرح مسلسل نہیں ہوتے بلکہ پہلے مطلع پھر کچھ اشعار اور کچھ اشعار کے بعد پھر مطلع۔ قصائد میں عموماً تین یا چار مطلعے ہوتے ہیں۔

غزل میں اکثر کئی مطلعے ہوتے ہیں اور یہ مطلعے غزل میں مسلسل یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ چنانچہ ان کو مطلع اول، مطلع ثانی مطلع ثالث کہا جاتا اور ایک یا دو یا جتنے بھی مطلعے ہوں ان کے بعد جو پہلا شعر ہوتا ہے اس پہلے شعر کو حسن مطلع کہتے ہیں نہ کہ مطلع ثانی کو۔ اگر مطلع ثانی کو حسن مطلع کہا گیا تو پھر سوم، چہارم، پنجم مطلعوں کو کیا کہا جائے گا۔ لہٰذا مطلعوں کے بعد جو پہلا شعر ہو اسی کو حسن مطلع کہنا بروئے عروض مناسب ہے اور اہل عروض کا اسی پر اتفاق ہے۔

(خواجہ سائل حیدری بینائی دارو غہ گنج لشکر گوالیار)

ایک استفسار کے جواب میں

۲۲ر جون ۶۶ء کے "ہماری زبان" میں محترمہ زینت جہاں صاحبہ نے مندرجہ ذیل شعر کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ شعر کس صاحب کا تحریر کردہ ہے ؎

تاقیامت شب فرقت میں گزر جائے گی عمر
سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک

یہ شعر مرزا غالب کی اس غزل کا ہے جس کا مقطع ہے ؎

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

حوالے کے لیے دیکھیے "نسخۂ حمیدیہ"[1] (ص ۹۹)

(امین۔ انوار الحسن انور ادیب)

محکمۂ تعلیمات شاکر نگر توجہ کرے

مدارس فوقانیہ ڈگوروفسا شکر نگر و بودھن کے سال حال کے انتہائی مایوس کن نتائج طلبہ و طالبات کے سرپرستوں کے لیے باعث پریشانی بنے ہوئے ہیں چونکہ ہر دو مقامات (شکر نگر اور بودھن) کے مدارس فوقانیہ میں ٹرینڈ گریجویٹ اساتذہ کی کمی اور سائنسی آلات کی عدم موجودگی کی وجہ سے طلبہ و طالبات کی تعلیم معیاری نہیں ہو رہی ہے۔ گذشتہ سال بھی انجمن ترقی اردو نے محکمۂ تعلیمات کی توجہ ان حقائق کی طرف منعطف کروائی تھی۔ مگر سال حال کے خراب نتائج (خصوصاً ایس ایس سی) میں اساتذہ کی کمی کے باعث ایک طرف طلبہ و طالبات کی عمریں خراب ہو رہی ہیں، دوسری طرف سرپرستوں کو پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو شاخ بودھن مستقر شکر نگر پھر ایک بار محکمۂ تعلیمات سے پُرزور اپیل کرتی ہے کہ فوری اس جانب خصوصی توجہ دے کر گرتے ہوئے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے اور قابل ٹرینڈ گریجویٹ اساتذہ کی تعیناتی کے علاوہ سائنسی و دیگر ضروری آلات کی سربراہی کا انتظام کرے اور طلبہ اور ان کے سرپرستوں کی تشویش کو دور کرے۔ امید ہے کہ محکمۂ تعلیمات کے ارباب متعلقہ انجمن ترقی اردو کی اس اپیل پر ہمدردانہ و منصفانہ غور کریں گے۔

(ساغر حیدرآبادی معتمد انجمن ترقی اردو شاخ بودھن شکر نگر)

ایک طالبہ کی رائے

اردو ہماری مادری زبان ہے۔ ہم جب اس کو بولتے ہیں تو بے جھجک مشکل سے مشکل مطالب کو سمجھاتے جاتے ہیں اور ان کے کسی پہلو کو بھی واضح کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زبان کو بولتے، سیکھتے اور سمجھاتے ہماری زندگی گذری ہے اور زندگی کی کوئی حاجت اور ضرورت ایسی نہیں جس کی ترجمانی اردو نہ کر سکتی ہو۔ نتیجہ صاف ہے کہ طالب علم کی منزلوں میں مادری زبان کے ساتھ دوسرے علوم بھی پڑھے جاتے ہیں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل اپنے شاعروں اور ادیبوں کی زبانی سننے اور پڑھنے سے بچے کی دماغی و ذہنی طاقت پروان چڑھتی جاتی ہے اور دماغ روشن سے روشن تر ہوتا جاتا ہے۔ اس روشنی میں دوسرے علوم کی گتھیاں بھی حل ہوتی ہیں۔ سوچ اپنی زبان میں گہری ہو جاتی ہے تو کسی اور گہری سوچ سے طالب علم گھبراتا نہیں۔ اس کی زندہ مثالیں آج کل کالجوں کے نتائج ہیں۔

اس سال ہمارے مہارانی کالج بنگلور کی چار طالبات جنھوں نے اردو کو ثانوی زبان کے علاوہ ([illegible]) کی حیثیت سے بھی پڑھا تھا، امتحان کے کئی پرچوں میں پوری یونیورسٹی میں پہلے اور امتیازی درجے میں پاس ہوئیں۔ میسور کے مہارانی کالج میں بھی ایک طالبہ جنھوں نے اردو کو ثانوی زبان کی اور میجر کی حیثیت سے پڑھا تھا میسور کی یونیورسٹی میں بی۔اے میں سب سے اول درجہ میں کامیاب ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچ چکی ہوں کہ اردو وہ روشنی ہے جو بھی اس روشنی کو اہتمام کے ساتھ حاصل کرتا ہے اس کی برکت سے اس کے دل و دماغ میں دوسرے سب علوم بھی روشنی حاصل کرتے ہیں اور وہ ترقی کی منزلیں آسانی سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔

ان حقیقتوں کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ طالبات اردو کی تحصیل میں احساس کمتری کا شکار نہ بنیں۔ بلکہ اپنی مادری زبان میں مہارت کی وجہ سے دوسرے علوم کی تحصیل میں اپنے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں۔

(حسن آرا بیگم)

کچھ داغؔ کے بارے میں

"ہماری زبان" کے ۲۲ جون ۱۹۹۶ کے شمارے میں انیس الحسن صاحب کا مضمون "کچھ داغؔ کی غزل کے بارے میں" نظر سے گزرا۔ مضمون بہت ہی تشنہ ہے۔ انیس الحسن صاحب لکھتے ہیں (۱) مرزا داغؔ ابھی چھوٹے ہی سے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ (۲) ان کی ماں نے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا۔ داغؔ کی عمر اس وقت تیرہ سال کی ہو چکی تھی۔ (۳) دلی کا ماحول شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ داغؔ کی ذہنی و دماغی تربیت ان ہی فضاؤں میں ہوئی۔ ذوقؔ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد ان کی شاعری میں نکھار آیا۔ (۴) داغؔ سے دلی چھوٹ گئی، وہ رام پور پہنچے۔ رام پور کے بعد حیدرآباد اور پھر دلی۔

اعتراض کی پہلی وجہ یہ ہے کہ عنوان "داغؔ کی غزل کے بارے میں" ہے مگر مضمون کی ابتدا سوانح سے ہوتی ہے۔ اگر سوانح دیے گئے تھے تو اتنے مختصر اور تشنہ کیوں؟ مندرجہ بالا اقتباس جہاں وضاحت طلب ہے وہیں بعض اقتباسات کی صحت میں بھی شک ہے۔ میں چاروں اقتباسات کی وضاحت مختصراً کیے دیتا ہوں۔

(۱) مرزا داغؔ جب سایۂ پدری سے محروم ہوئے اس وقت چھ سات سال کے تھے۔ (۲) مرزا فخرو بہادر شاہ کے بیٹے تھے جب داغؔ کی والدہ سے ان کا نکاح ہوا اس وقت داغؔ کی عمر تیرہ سال کی نہیں تھی۔ اس لیے کہ (۳) داغؔ کی شاعری میں نکھار ذوقؔ سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد آیا اور ذوقؔ کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنے کا موقع قلعۂ معلیٰ میں آنے کے بعد ظاہر ہوگا کیونکہ ذوقؔ، بہادر شاہ اور مرزا فخرو کے استاد تھے اور جب داغؔ ذوقؔ کے شاگرد ہوئے اس وقت ان کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔ اس لیے نکاح کے وقت ان کی عمر اور کم ہوگی۔ (۴) ہنگامۂ غدر سے دس سال پیشتر مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس انقلاب کے بعد داغؔ رام پور چلے گئے۔ رام پور میں چالیس سال تک مقیم رہے پھر مختلف شہروں کی سیر و سیاحت کے بعد حیدرآباد پہنچے اور یہیں اٹھارہ برس گزار کر ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو اٹھارہ روز فالج کے مرض میں مبتلا رہ کر انتقال فرمایا۔ انیس صاحب کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغؔ دلی سے رام پور، رام پور سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے پھر دلی گئے۔ لیکن حیدرآباد آنے کے بعد داغؔ پھر دلی نہیں گئے تھے اور یہیں اٹھارہ سال رہ کر انتقال فرمایا تھا۔

(مناظر عاشق ہرگانوی)

[1] یا نسخۂ عرشی ص ۱۰۱۔ ادارۂ "ہماری زبان"

بہار پور ضلع چاندہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کر دی گئی

اردو دوستوں سے انجمن کا ممبر بننے کی دعوت

بہار پور کے اردو دوستوں کو سن کر مسرت ہوگی کہ انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ بہار پور میں بھی قائم کر دی گئی ہے۔ وہاں کے اردو دوستوں سے دعوت ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن کے ممبر بن کر اردو کے مقاصد کو تقویت پہنچائیں۔

ممبری کا فارم حاصل کرنے کے لیے براہ کرم جناب عبدالرشید صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار پور نزد جامع مسجد بہار پور سے ملاقات کریں۔

(بشیر الدین سکریٹری انجمن ترقی اردو (علاقہ [illegible]))

تلوک چند محروم کو ان کی ۸۰ ویں سالگرہ پر خراج عقیدت

نئی دہلی، ۳۰ر جون۔ آج یہاں سورگباشی تلوک چند محروم کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ تقریب کی صدارت جناب مہر چند کھنہ مرکزی وزیر نے فرمائی۔ جناب گوپی ناتھ امن، جناب علی جواد زیدی، جناب مالک رام، جناب پریم ناتھ، جناب رام لال وغیرہ نے مقالے اور تقریریں کیں اور مختلف شعرا نے اپنی نظمیں سنائیں۔ جناب محروم کے صاحبزادے جناب جگن ناتھ آزاد نے حضرت محروم کی ایک نظم سنائی جو انھوں نے ۱۹۰۷ء میں لکھی تھی اور جس میں اس وقت مزار نورجہاں کی جو حالت تھی اس پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ جناب صدر نے حضرت محروم کو پُرزور الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ ان کے کلام میں حب الوطنی اور سیکولر ڈیمو کریسی کا سبق دیا گیا ہے۔

یہ تقریب دلی پبلک لائبریری میں مجلس ادب دلی کے زیر اہتمام منائی گئی۔ دلی کے بھی سرکردہ ادیب، اردو اخبارات و جرائد کے مدیر، شاعر اور دوسرے بہت سے اردو دوست اس جلسہ میں شریک تھے۔ دلی پبلک لائبریری کا تمام ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جناب علی جواد زیدی نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیے۔

جلسہ کے صدر جناب مہر چند کھنہ نے اپنی تقریر میں خاص طور پر عیسیٰ خیل (سرحدی صوبہ پاکستان) میں وہاں کے لوگوں کی طرف سے محروم صاحب کی سالگرہ منائے جانے کی اطلاع کا تذکرہ کیا۔

جناب مہر چند کھنہ نے شعرا سے اپیل کی کہ وہ محروم صاحب کے نقش قدم پر چل کر سیکولر جمہوریت کے استحکام کے لیے کام کریں اور قومی یکجہتی کے جذبہ کو اپنے خیالات اور کلام کے ذریعہ فروغ دیں۔

جناب پریم ناتھ در نے جو آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن میں شعبۂ اردو مجلس کے سربراہ ہیں محروم صاحب کی قومی اور وطنی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آپ نے کہا کہ محروم صاحب نے اردو کے ایک مخصوص حلقہ کے اس انداز فکر کو شکست دی کہ پنجاب اردو کا علاقہ نہیں ہے۔ آپ نے اردو زبان کی افادیت اور ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری زبان ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج بھی ہندوستان کے ہر ایک شعبۂ زندگی میں اردو کے ستون موجود ہیں۔ اردو افسانہ آج بھی دوسری زبانوں کے افسانوں سے بہت آگے ہے۔ اس زبان کے ذریعہ میل ملاپ کو تقویت ملی ہے۔

اس سے قبل جناب گوپی ناتھ امن نے محروم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی بعض قومی نظموں سے اشعار پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ محروم صاحب نے کس پس منظر میں یہ اشعار کہے۔ مشہور افسانہ نویس جناب رام لال نے محروم صاحب کے کلام، قدرتی مناظر اور آفاقی قدروں کے حوالے سے ایک مضمون پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ آخر میں جناب مالک رام نے جنھوں نے کہ جناب کھنہ کے چلے جانے کے بعد جلسہ کی صدارت کی بہترین الفاظ میں محروم صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جن شاعروں نے اس موقع پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا ان میں طالب حیدر دلی، منور لکھنوی، خمار دہلوی، رام کرشن مضطر، خان غازی کابلی، مخمور سعیدی، کرشن موہن، بہار برنی اور دوسرے شعرا شامل ہیں۔

(الجمعیۃ)

میونسپل ادبی ایوارڈ پانے والے اردو فن کاروں کے اعزاز میں استقبالیہ اور مشاعرہ

بھوپال، یکم جولائی۔ حال ہی میں میونسپل کونسل بھوپال کی جانب سے اردو اور ہندی کے دس دس فن کاروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۴ر جون ۶۶ء کو ایک استقبالیہ تقریب میں پانچ پانچ سو روپیہ بیس فن کاروں کو ادبی ایوارڈ دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھوپال کی سب ہی قابل ذکر ادبی انجمنوں کی جانب سے ادبی ایوارڈ پانے والے فن کاروں کو استقبالیے دیے جانے کا سلسلہ جاری ہے (جن میں جمعیۃ علما بھوپال، ادبی سنگم، رائٹرز ایسوسی ایشن، زینت ادب، ایم۔ پی ہیکرس ایسوسی ایشن، میونسپل کونسل، جناب اسرار مسعود ٹھیکیدار جنگلات خاص طور پر قابل ذکر ہیں)

اسی سلسلہ میں اہالیان محلہ جہانگیر آباد کی جانب سے بازار جہانگیر آباد میں ایک شاندار اور برقی روشنی سے منور شامیانہ کے زیر سایہ اردو فن کاروں کے اعزاز میں نہایت شاندار استقبالیہ دیا گیا اور مشاعرہ ہوا۔ اردو کے جن قابل ذکر فن کاروں کو میونسپل ایوارڈ دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ علامہ مجوی صدیقی، ۲۔ جناب ایم عرفان (صدر انجمن ترقی اردو بھوپال و مدیر شعلۂ حیات)، ۳۔ حضرت وکیل بھوپالی، ۴۔ جناب اظہر سعید خاں، ۵۔ جناب سید مقصود علی عرفان، ۶۔ جناب سید محمود الحسینی (مدیر ندیم)، ۷۔ جناب مقصود عمرانی، ۸۔ جناب ڈاکٹر شفا گوالیاری، ۹۔ جناب قمر جلالی اور ۱۰۔ جناب عشرت قادری۔

جلسہ کی صدارت مولانا عزیزی ترمذی نے کی۔ اوپر بتانے کی تقریب کے بعد اردو فن کاروں کی جانب سے بھوپال کے مشہور مورخ جناب ایم عرفان نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں تاریخی پس منظر کے ساتھ بتایا کہ بھوپال ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے کیونکہ اس کا پہلا بانی راجہ بھوج خود ذی علم اور ادب نواز تھا اور بھوپال کا دوسرا بانی سردار دوست محمد خاں بھی ذی علم اور ادب نواز تھا اور محلہ جہانگیر آباد

کے بانی نواب جہانگیر محمد خاں جو چوٹی کے اردو ادیب اور شاعر اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس لحاظ سے محلہ جہانگیر آباد کی علمی و ادبی روایات نہایت شاندار رہی ہیں۔ آپ نے اس بات کے لیے میونسپل کونسل کی تعریف کی کہ اس نے فن کاروں کو اعزاز دینے کی ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔ جناب ایم۔ عرفان نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہندوستان کی بعض دوسری میونسپلٹیوں کی طرح بھوپال میونسپل کونسل کو بھی ہر سال اپنے شہر کے بزرگ فن کاروں کا "جشن فن کار" منانے کی رسم شروع کرنا چاہیے تاکہ ادب کے معماروں کو ان کی زندگی ہی میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا جا سکے۔ آخر میں جناب ایم۔ رفیق کنوینر استقبالیہ نے اپنی مختصر تقریر میں اردو فن کاروں کو میونسپل ایوارڈ دیے جانے پر اظہار مسرت کیا اور صاحب صدر سے فن کاروں کو ہار پہنانے کی استدعا کی۔

استقبالیہ تقریب کے فوراً بعد ہی محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا جو ایک بجے رات تک جاری رہا۔ بھوپال کے پچھلے دس سال کی تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جو شروع سے آخر تک سامعین نے نہایت پرسکون اور خوشگوار ماحول میں سنا۔ انجمن ترقی اردو بھوپال کے زیر اہتمام "اردو مشاعرہ" ۱۹۵۵ء اور مدھیہ پردیش اردو کنونشن نومبر ۱۹۵۵ء کے بعد یہ پہلا پبلک اور برسرعام مشاعرہ تھا کہ جو اس قدر سکون کے ساتھ سنا گیا۔ ورنہ گزشتہ چند سالوں سے شعراء کے باہمی اختلافات اور بعض مفاد پرست کا مشاعروں کے نام پر دولت زر کمانے کی ہوس نے یہ حال کر دیا تھا کہ ملک کے مشہور و معروف شعرا حضرات بھی ہوٹنگ سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان کو پانچ شعر پڑھنا بھی ناممکن بنا دیا جاتا تھا لیکن یہاں جہانگیر آباد کے اس برقی روشنی سے جگمگاتے شامیانہ کے زیر سایہ اور چاروں طرف کھڑے ہوئے ہزاروں سخن فہم اور شائستہ حضرات نے نہایت نظم و ضبط کو برقرار رکھتے ہوئے اس عظیم الشان مشاعرہ کو کامیاب بنایا۔

اور یہ بھی پہلا موقع ہے کہ حضرت شعری بھوپالی نے ایک ہی نشست میں ایک ہی وقت یکے بعد دیگرے آٹھ غزلیں پڑھیں اور حضرت اختر سعید نے دو غزلیں۔ جن شعرا حضرات نے مشاعرہ میں شرکت کی ان میں حضرت رمزی ترمذی، شعری بھوپالی، اختر سعید، عرفان انصاری، مقصود عرفان، مقصود عمرانی، پروفیسر شہاب اشرف، شاہد بھوپالی، عشرت قادری، نجمت الحسینی، وحید پرواز، فیض تابش، شفق تنویر، کامل بہزادی، عزیز گوالیاری، رشید انور، سید حیدر علی حیدر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(ایک نامہ نگار)

سالانہ جلسہ انجمن ترقی اردو کوٹہ (راجستھان)

کوٹہ۔ ۲۶ جون شب کے ۹ بجے بمقام گھنٹہ گھر زیر صدارت شری ناتھو لال صاحب ایڈوکیٹ انجمن ہذا کا سالانہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں شری داؤ دیال صاحب جن سنگھ لیڈر چیرمین میونسپل بورڈ کوٹہ نے جامعہ اردو علی گڑھ سنٹر کوٹہ سے کامیاب طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کیں۔

جلسہ کا افتتاح انجمن مدرسہ اسلامیہ کے ایک طالب علم نے تلاوت قرآن پاک سے کیا اور چند طالبات نے ڈاکٹر اقبال کی دعا "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" بڑے پُر ترنم سے سنائی۔ جناب عبدالرحیم صاحب ایڈوکیٹ جنرل سکریٹری انجمن ہذا نے انجمن کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی اور سامعین کو پُرزور الفاظ میں توجہ دلائی کہ یکم جولائی ۱۹۶۶ء کے کھلنے والے سرکاری مدارس میں بچوں کو اردو جماعتوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل کرائیں۔ جناب عبدالشکور صاحب شمیم ایم۔ اے نے جامعہ اردو کے امتحانات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے عوام کو جامعہ کے امتحانات کے فوائد بتائے اور طلباء کو توجہ دلائی کہ ان امتحانات میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل ہو کر اپنی قابلیت میں اضافہ کریں۔ بعد ازاں مشاعرہ کا پروگرام شروع ہوا۔ مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء میں جاوید لطیف حیدرآبادی اور جناب راہی رامپوری سکریٹری انجمن ترقی اردو رامپور نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ جناب عقیل احمد صاحب شاداب نے اپنی جوشیلی تقریر میں اردو کو ملک کی سالمیت کا نشان بتایا اور کہا کہ ہمارے چند دوست اردو سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوسی دشمن ملک نے اس کو اپنا لیا ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہمارے وطن عزیز کا تھوڑا سا حصہ ان کو مل گیا ہے اسی طرح اردو ادب کا بھی کچھ حصہ ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔

شری ناتھو لال ایڈوکیٹ صدر مشاعرہ نے اپنی تقریر میں چیرمین میونسپل بورڈ کوٹہ کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے دفتر میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی درخواستیں لیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ ہندی اور اردو دونوں مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبانیں ہیں۔ دونوں کی کوششوں سے یہ دونوں زبانیں پیدا ہوئی ہیں۔ رحیم، کبیر، ملک محمد جائسی وغیرہم کو اگر ہندی ساہتیہ سے الگ کر دیا جائے تو ہندی میں کیا بچتا ہے۔ اسی طرح اردو میں پریم چند، برجموہن دتاتریہ کیفی، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملا، گوپی ناتھ امن اور ہردے ناتھ کنزرو کو اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میری خواہش ہے کہ اردو اور ہندی کا سنگم ہو اور ایسے مشاعرے اور نشستیں دونوں زبانوں اور ملک کے لیے نیک فال ہیں۔

شری داؤ دیال چیرمین میونسپل بورڈ کوٹہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جو لوگ زبان کے معاملہ کو لے کر جھگڑا کرتے ہیں وہ تنگ نظر ہیں اور یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ یہاں بھاشا کی بنیاد پر عوام کو بہکایا جاتا ہے اور عوام میں کشیدگی پیدا کی جاتی ہے۔ اردو کنسٹی ٹیوشن کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اردو کو ترقی کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ دوسری زبانوں کو۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میں اپنے دفتر میں اردو اور ہندی میں درخواستیں قبول کروں گا لیکن انگلش میں نہیں گو کہ میں اردو لپی (رسم الخط) نہیں جانتا ہوں لیکن میں اردو کی درخواستیں اپنے کسی اردو داں کلرک سے پڑھوا کر سمجھ لوں گا۔ جلسہ میں کافی بڑی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کی اور شب کے ۲ بجے بڑی کامیابی کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

عبدالسلام ایڈوکیٹ
سکریٹری انجمن ترقی اردو، کوٹہ، راجستھان

ناگپور یونیورسٹی کے فیصلے کے خلاف

انجمن ترقی اردو علاقہ ودربھ کے سکریٹری کا بیان

کامٹی۔ فیض انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو علاقہ ودربھ نے ناگپور یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے اس فیصلے پر کہ بی۔ اے پارٹ ایک۔ بی۔ ایس سی پارٹ ایک بی کام پارٹ ایک۔ بی۔ ایس سی زراعت پارٹ ایک سے اردو اختیاری مضمون کو ختم کر دیا جائے حسب ذیل اخباری بیان جاری کیا ہے:۔

ناگپور یونیورسٹی کا تازہ فیصلہ اخبارات میں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی اس یونیورسٹی نے یہ طے کر رکھا ہے کہ یہاں سے اردو کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اس کا ثبوت یہ ہے کہ چند ماہ قبل اس نے اکیڈمک کونسل سے اردو کی نمائندگی کو ختم کر دیا۔ اور اب یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ بی۔ اے، بی۔ ایس سی اور بی کام میں اردو اختیاری مضمون نہیں ہوگا جس کا مطلب صاف صاف یہ ہے کہ اردو میڈیم کے تمام ہائی اسکول یا تو بند کر دیے جائیں یا انھیں مرہٹی میڈیم میں تبدیل کر دیا جائے۔

اردو زبان کو ختم کرنے کا یہ منصوبہ کوئی نیا نہیں ہے لیکن نیا صرف یہ ہے کہ اسے ایک دم سامنے نہیں لایا جاتا۔ قاتل دو ہی طریقوں سے کسی کی جان لیتا ہے۔ پہلا یہ کہ ایک دم گولی مار دی جائے یا اس کے سینے میں خنجر اتار دیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو وقتاً فوقتاً ایسا زہر پلایا جائے جس سے آہستہ آہستہ اس کی موت واقع ہو جائے۔ ناگپور یونیورسٹی نے اردو کو ختم کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اپنایا ہے اور وہ برابر اپنے پلان پر عمل کر رہی ہے۔

پردۂ زنگاری سے معشوق کا ہاتھ باہر آجانے کے بعد اسے ملامت کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ اردو والوں کو یہ سوچنا ہوگا اور سر جوڑ کر سوچنا ہوگا کہ وہ اس علاقے میں اردو زبان کو کیسے بچا سکتے ہیں۔ کیا وہ اخباری بیان نکال کر یا چند احتجاجی جلسے منعقد کر کے اس کے قانونی حقوق کو غصب ہونے سے بچا سکتے ہیں اور اس معشوق کو جو پردۂ زنگاری کے پیچھے بیٹھ کر اردو زبان کی گردن اس کے تن سے جدا کر دینے پر تُلا ہوا ہے ایسا کرنے سے روک سکتے ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ودربھ کے ہر اس اردو داں کو انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔ جو اردو کو اپنے اجداد کا ترکہ سمجھتا ہے اور جس کی بقا میں اپنی حیات مضمر پاتا ہے۔

آخر میں ودربھ کی انجمن ترقی اردو کی شاخوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے احتجاج ناگپور یونیورسٹی، حکومت مہاراشٹر، حکومت ہند اور کمشنر لسانی اقلیتیں حکومت ہند الہ آباد کو روانہ کریں اور اس کی ایک ایک کاپی مجھے اور انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کو بمبئی بھیجیں۔

ودربھ کے وہ اردو داں جو اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور فرما رہے ہیں مجھ سے ربط قائم کریں اس لیے کہ میں اردو پر حکومت مہاراشٹر کی زیادتیوں کے خلاف ایک موثر اقدام کرنے پر غور کرنے کے لیے اردو کانفرنس طلب کرنے کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو مہاراشٹر بمبئی سے مراسلت کر رہا ہوں۔

(فیض انصاری۔ نعیم الدین اسٹریٹ بمبئی)

ناگپور یونیورسٹی اردو کی تعلیم بحال کرے

کامٹی انجمن ترقی اردو کا مطالبہ

کامٹی۔ ناگپور یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل نے اپنے سابقہ اجلاس میں مراٹھی یا ہندی کی لازمی مضمون کی حیثیت سے تعلیم کے متعلق جو تجویز پاس کی ہے وہ سراسر غیر دانشمندانہ اور قطعی غیر آئینی ہے۔ ناگپور یونیورسٹی کے ایجنڈا پر یہ مد پہلے سے موجود نہیں تھی۔ وقتی طور پر ناگپور یونیورسٹی کے اس فیصلے سے غیر ہندی یا غیر مراٹھی اصحاب کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس فیصلے کی رو سے ڈگری کورس میں طلبہ کو انگریزی کے علاوہ ہندی یا مراٹھی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنا ہوگا۔ اس فیصلے سے اردو طلبہ کے حقوق پر زبردستی قبضہ جمانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

انجمن ترقی اردو شاخ کامٹی ناگپور یونیورسٹی کے اس فیصلے پر اپنے گہرے غم و غصے کا اظہار کرتی ہے۔ اور مرکزی حکومت نیز صوبائی ارباب اقتدار سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ناگپور یونیورسٹی کے اس فیصلے کو رد کر کے اردو و دیگر غیر ہندی و غیر مراٹھی طلبہ کے ساتھ انصاف کرے۔

(شمیم فیضی، سکریٹری انجمن ترقی اردو، شاخ کامٹی)

ایک یادگار ادبی نشست

جموں۔ ۲۶ر جون ۶۹ء کو بزم اردو ادب جموں کی طرف سے ڈاکٹر مدن موہن صاحب جاولہ جو انڈمان سے تشریف لائے تھے کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ ادبی نشست بزم ہذا کے صدر جناب اندر جیت لطف کے دولت کدہ پر ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شام ۷ بجے سے لے کر رات ۱۱ بجے تک یہ محفل شعر و سخن جاری رہی اس سے قبل جموں میں کبھی اتنے بڑے پیمانے پر کسی ادبی نشست کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ نشست کے کئی دور ہوئے اور سامعین نے جی کھول کر داد دی۔ جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے اس نشست کی رونق دوبالا فرمائی اُن میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں:۔ جناب طالب امین آبادی۔ جناب اندر جیت لطف جناب عشرت کاشمیری۔ جناب عابد مناوری۔ جناب دینا ناتھ رفیق۔ جناب پنڈت دیا رتن عاصی۔ جناب ذہین رانی داتش۔ جناب برج نندن شفق اور عرش صہبائی۔

(عرش صہبائی، سکریٹری بزم اردو ادب۔ جموں)

ضروری گذارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کے پتے پر فرمائیے۔

بعض خطوط پر منصب کے بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کے جواب میں تعطل ہو جاتا ہے جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کہیں گئے ہوئے ہیں یا بیمار ہیں دورے پر ہیں یا عہدہ سے علاحدگی کی کوئی اور صورت ہو تو ڈاک کھولی نہیں جاتی اور [illegible] کا جواب بروقت نہیں دیا جا سکتا اس لیے سب سے بہتر ہے [illegible] اپنے خط جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پتہ پر بھیجیے۔

تبصرے

شہریار

یادگارِ جگر — مرتبہ محمد اسلام

قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ دانش محل بک سیلرز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

بقول مرتب جگر مرادآبادی کے "غیر مطبوعہ اور تلف شدہ کلام کی مکمل یادگار" ہے۔ کم سے کم میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ 'یادگار جگر' میں جتنے اشعار شامل ہیں وہ سب جگر صاحب کے نتیجۂ فکر ہیں اور ابھی تک کہیں شایع نہیں ہوئے ہیں۔ محمد اسلام صاحب نے چونکہ ابھی حال میں جگر صاحب پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے اس لیے ان کے مرتب کردہ اس کتاب کے مندرجات پر شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن صفحہ ۱۱ پر دورِ اول کے زیر عنوان جو سب سے پہلا شعر مع پانچ سطری نوٹ کے درج ہے وہ یگانہ کا بہت مشہور شعر ہے۔ شعر یہ ہے:-

کشتیِ حیات اپنی جا رہی تھی دھارے پر
سنگدل تماشائی بیٹھے تھے کنارے پر

یگانہ کے اس شعر کو جگر صاحب سے منسوب دیکھ کر میری طرح اور لوگ بھی حیران ہوں گے اور کیا عجب محمد اسلام صاحب نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں اس شعر سے جگر کے کسی "خاص پہلو" پر روشنی ڈالی ہو جیسا کہ میر تقی میر سے منسوب ایک شعر (شکست و فتح نصیبوں سے ہے...) کو سامنے رکھ کر لوگوں نے میر کی شاعری کو ایک خاص پہلو سے پرکھا ہے۔ جگر صاحب کی شخصیت اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں خاصا مواد ہے۔

نگارشاتِ جگر — مرتبہ محمد اسلام

قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

یہ کتاب بھی ڈاکٹر محمد اسلام صاحب نے مرتب کی ہے۔ اس میں جگر صاحب کی وہ نثری تحریریں ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں ان تحریروں میں سے اکثر تقریظیں، تبصرے اور مقدمے ہیں جو تاثراتی تنقید کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جگر صاحب ایک اچھے شاعر تھے لیکن ان میں وہ ذہنی تنظیم اور ترتیب نہ تھی جو ایک نقاد کے لیے ضروری ہے اور پھر تقریظ، تبصرے یا مقدمے میں تنقید کی گنجائش بھی کم ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی ان تحریروں کو صرف اس نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیے کہ ان کو جگر صاحب نے لکھا ہے۔ ہاں ان سے جگر صاحب کے تخلیقی عمل ان کے فنی عقائد اور جمالیاتی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مسلمانانِ گونڈہ کے اجتماع میں جگر صاحب نے گاندھی جی کے جلسۂ تعزیت میں جو مضمون پڑھا اور جو اس کتاب کے صفحہ ۸۴ تا ۸۹ تک چھپا ہوا ہے، بڑا اثر انگیز ہے اس سے جگر صاحب کی دردمندی، انسانیت دوستی اور ہندوستان کی سیکولر اقدار سے محبت اور گاندھی جی کی ہمہ گیر شخصیت سے جگر صاحب کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ ۲۰۰ صفحات کی یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

جگر کے خطوط — مولفہ محمد اسلام

قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

محمد اسلام صاحب نے اس کتاب میں جگر صاحب کے وہ خطوط یکجا کیے ہیں جو انھیں مختلف "جگر پرستوں" سے حاصل ہوئے۔ جگر صاحب کی شرافتِ اخلاق، دردمندی، انسانیت، دوست نوازی، وسیع القلبی اور جذبۂ ایثار و قربانی کا ہر وہ شخص معترف ہے جس کو جگر صاحب سے کسی قسم کا ربط یا تعلق رہا ہے اس کا ثبوت وہ والہانہ عقیدت و محبت، احترام و عزت ہے جو جگر صاحب کی اپنی زندگی ہی میں مل گئی تھی۔ ان کی شخصی خوبیوں اور ذاتی صفات کا سحر پیر و جواں پر یکساں چلا بلکہ اس سحر نے ان کے شاعرانہ مرتبہ اور قدر و قیمت کا صحیح تعین ان کی زندگی میں نہ ہونے دیا۔ خطوط کے اس مجموعے سے جگر صاحب کی شخصیت کے ان تمام اعلیٰ اوصاف کی تصدیق ہوتی ہے جو جگر صاحب سے منسوب ہیں ہر خط میں ان کی صاف و شفاف شخصیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کے "دلِ گداختہ" کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ان خطوط سے جہاں اردو خطوط کے سرمائے میں اضافہ ہوگا وہاں جگر صاحب کی شخصیت اور شاعری کے کچھ نئے پہلو بھی سامنے آئیں گے۔ کاش جگر صاحب کے وہ خطوط بھی کسی طرح منظر عام پر آ جائیں جو انھوں نے اپنے ایسے دوستوں کو لکھے ہیں جو ان کے ہر "رازِ درونِ خانہ" کو جانتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ہمارا جھنڈا

شائع کردہ پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات دہلی۔

قیمت ایک روپیہ۔

۴۴ صفحات کا یہ کتابچہ ہندوستان کے قومی جھنڈے کی تاریخ ہے جو آرٹ پیپر پر ٹائپ میں تصویروں کے ساتھ بڑے سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ جھنڈے کی یہ تاریخ ایک طرح سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی مختصر داستان بھی ہے۔ اس لیے اس کو عام کرنا چاہیے جس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کی قیمت کم کر دی جائے بلکہ اگر ہو سکے تو مفت تقسیم کی جائے۔ اس سے ایک قومی ضرورت پوری ہوتی ہے اور اس لیے حکومت ہند کو اس سلسلے میں "سود و زیاں" سے بلند ہونا چاہیے۔

"ہماری زبان" سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم یونیورسٹی کمرشیل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا